کراچی

ریت میں دفن ہزاروں کہانیاں

مقررین: سبین آغا۔ عارف حسن

اربن ریسورس سینٹر

اگست ستمبر 2026ء

F-144-68

ٹرانسکرپشن:

کشف ناصر

ادارت :

بلقیس ، سیما لیاقت

عکاسی:

شکیل یونس

"کراچی: ریت میں دفن ہزاروں کہانیاں"

کے عنوان سے یہ فورم 28 اپریل 2026ء کو یوآرسی میں منعقد ہوا۔

یوآرسی رابطے کے لئے:

فون نمبر: 021-34387692

ای میل:urckhi@yahoo.com

ویب سائٹ:www.urckarachi.org

کراچی: ریت میں دفن ہزاروں کہانیاں

مقررین:

سبین آغا۔صحافی و دستاویزی فلم ساز
عارف حسن ۔ چیئرمین اربن ریسورس سینٹر

تاریخ:28 اپریل 2026ء

اربن ریسورس سینٹر
A-2 دوسری منزل ویسٹ لینڈ ٹریڈ سینٹر، کمرشل ایریا،
شہید ملت روڈ، کراچی، پاکستان

021-34387692
urckhi@yahoo.com
www.urckarachi.org
fb.com/urckhi
@urckhi

زاہد فاروق: میں آپ تمام حاضرین، اساتذہ اور محققین کو آج کے اس اہم فورم میں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کے سیمینار میں ہمارے ساتھ سبین آغا صاحبہ موجود ہیں، جو پیشے کے اعتبار سے ایک مایہ ناز صحافی ہیں اور پاکستان سمیت کئی بین الاقوامی میڈیا ہاؤسز کے ساتھ کام کرنے کا وسیع تجربہ رکھتی ہیں۔ سبین صاحبہ نہ صرف بہترین دستاویزی فلمیں (Documentaries) بناتی ہیں بلکہ ایک ممتاز صاحبِ کتاب بھی ہیں۔ ویسے تو ہمارے ہاں صحافی بہت سے ہیں، لیکن صاحبِ کتاب ہونا اور خصوصاً کراچی کے زمینی حقائق پر کتاب لکھنا ان کا ایک منفرد اعزاز ہے۔ انہوں نے اپنے برسوں کے صحافتی تجربات کو اپنی حالیہ کتاب کی زینت بنایا ہے اور ہمیں ان پوشیدہ کرداروں سے متعارف کروایا ہے جو اس شہر میں" چھلاوے" کی طرح حرکت کرتے ہیں۔ انہوں نے کراچی کے مختلف علاقوں کے چھوٹے چھوٹے بااثر افراد، وہاں کے مقامی نظام اور ان کی کہانیوں کو بہت قریب سے دیکھا اور پھر دستاویزی فلموں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔ یہ ایک ایسا کٹھن کام ہے جو صرف کوئی جرات مند، نڈر اور تحقیقاتی صحافی (Investigative Journalist) ہی مکمل دل جمعی اور دیانتداری کے ساتھ کرسکتا ہے اور ایسے صحافی آج کے دور میں بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔

کراچی کے مخصوص تناظر میں سبین آغا صاحبہ نے ایک شاہکار کتاب" کراچی: ایک نہیں، کئی ہیں" تحریر کی ہے، جس میں انہوں نے اس شہرِ بے کنار کی مختلف سمتوں، رنگوں اور تضادات کے حوالے سے تفصیلی بات کی ہے۔ انہوں نے کورنگی، لیاری اور دیگر دور دراز بستیوں میں رہنے والے لوگوں کی طرزِ زندگی، ان کے شب و روز اور سماجی

مسائل کا احاطہ کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس ایک شہر کے مختلف علاقوں میں رہنے والوں کے مسائل اور ان کے زمینی حقائق ایک دوسرے سے کتنے مختلف اور منفرد ہیں۔

اسی پسِ منظر میں آج کے ہمارے اس فورم کا موضوع ہے "کراچی: ریت میں دفن ہزاروں کہانیاں"۔ کراچی اصل میں کیا ہے؟ یہ کیسا ہے؟ اور وہ کہانیاں جو کبھی اس معاشرے کے سامنے یا میڈیا کی سرخیوں میں نہیں آسکیں، ان تمام پوشیدہ پہلوؤں پر آج سبین آغا صاحبہ تفصیلی گفتگو کریں گی۔

سبین آغا صاحبہ کے علاوہ ہمارے ساتھ اربن ریسورس سینٹر کے چیئرمین، معروف آرکیٹیکٹ اور ٹاؤن پلانر، محترم جناب عارف حسن صاحب بھی موجود ہیں۔ یوں تو عارف حسن صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں، لیکن یہ کہنا ضروری ہے کہ عارف صاحب نے پاکستان اور بین الاقوامی سطح پر ہمیشہ اس پسماندہ اور محنت کش طبقے کی آواز کو توانا کیا ہے جن کے حقوق کے لیے کوئی دوسرا آواز بلند نہیں کرتا۔ میں اب مائیک سبین آغا صاحبہ کے حوالے کرتا ہوں اور ان سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اسٹیج پر تشریف لائیں اور آج کے موضوع کے حوالے سے اپنے خیالات اور مشاہدات کا آغاز کریں۔

سبین آغا: بہت شکریہ زاہد صاحب! آپ نے نہایت تفصیل کے ساتھ تعارف کروایا اور مجھے تو یوں لگتا ہے کہ آپ نے میری تعریف میں اتنے بڑے بڑے الفاظ استعمال کر دیے ہیں کہ اب میرے پاس بات کرنے کے لیے کچھ خاص بچا ہی نہیں ہے۔ میں خود کو اتنی بڑی شخصیت تو نہیں سمجھتی، لیکن میں آپ، محترم جناب عارف حسن صاحب، سیما لیاقت صاحبہ اور پوری یو آر سی (URC) کی ٹیم کی دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ سب نے میرے کام اور میری اس کاوش کو اتنی بڑی تکریم بخشی۔

۞ صحافت کے 25 سال: مقامی بمقابلہ عالمی رپورٹنگ کا فرق

میں پچھلے 25 سالوں سے صحافت کے شعبے سے وابستہ ہوں اور بنیادی طور پر دستاویزی فلمیں (Documentaries) بناتی ہوں۔ اس دوران میں نے پاکستان کے تمام صفِ اول کے اداروں سمیت کئی بڑے بین الاقوامی میڈیا ہاؤسز کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔ اپنے اس طویل تجربے کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ کسی بھی واقعے یا بحران کو مقامی سطح پر رپورٹ کرنے اور عالمی سطح پر پیش کرنے کے طریقہ کار میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بین الاقوامی میڈیا کے لیے رپورٹنگ کرتے ہوئے ہمیں قارئین کی

سبین آغا ایک ممتاز صحافی اور دستاویزی فلم ساز ہیں۔ صحافت وفلم سازی کے دشت کی مسافت گزشتہ پچیس برسوں سے جاری و ساری ہے۔ پاکستانی برقی ذرائع ابلاغ کی اولین خاتون کرائم جرنلسٹس میں سے ایک ہونے کی حیثیت سے انہوں نے کراچی کی زیرزمین جرائم کی نگری سمیت تندوتیز سیاست کے میدان میں ایک ایسی راہ ہموار کرنے کی سعی کی جہاں عورت کا وجود ہی ایک انقلاب تھا۔

جیو نیوز، ایکسپریس 24/7، آج نیوز، سی این بی سی اور دیگر سے بی بی سی ورلڈ سروس، نیشنل جیوگرافک چینل، اسکائی ٹی وی سمیت متعدد ملکی و بین الاقوامی اداروں میں ان کی جرات مندانہ صحافت انسانی حقوق، سماجی انصاف اور صنفی حقوق کی حقیقت نگاری کی عکاسی کرتی ہے۔ ایک منفرد صاحب کتاب بھی ہیں، جن کی تصنیف "کراچی: ایک نہیں، کئی ہیں"، شہرِ بے کنار کے تضادات اور کورنگی و لیاری جیسی دور دراز بستیوں کے سماجی مسائل کا عمیق احاطہ کرتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر دنیا بھر کے صحافیوں کو خطروں کے درمیان سچ کہنے کا ہنر سکھانے والی ایک معتبر استاد بھی ہیں۔ اپنی جرات مندانہ اور دیانتدارانہ صحافت کی وجہ سے میڈیا انڈسٹری میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

دلچسپی، ان کی نفسیات اور قربِ مکانی (Proximity) جیسے اہم محرکات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ جو مسائل یا پسِ منظر کراچی کے عام ناظرین وقارئین کے لیے سمجھنا انتہائی آسان ہوتے ہیں، انہیں عالمی سطح کے سامعین کو سمجھانا بہت کٹھن کام ہے کیونکہ وہ یہاں کے زمینی حقائق سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لیے عالمی سطح پر رپورٹنگ کرتے ہوئے ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ نہایت آسان اور جامع انداز اختیار کیا جائے تا کہ یہاں کے حالات کو دنیا کے سامنے درست تناظر میں رکھا جا سکے۔

جہاں تک میری کتاب کا تعلق ہے، تو میں یہ بتاتی چلوں کہ یہ کتاب محض کاغذ کا کوئی ٹکڑا نہیں، بلکہ یہ میرے پچھلے 25 سالوں کی انتھک محنت، میرے خوابوں، میرے احساسات اور اس شہرِ بے کنار سے میری بے پناہ محبت کا نچوڑ ہے۔

۞ انفراسٹرکچر سے بڑا مسئلہ: تعصب اور نفرت انگیزی

جب بھی کراچی کے مسائل پر کوئی گفتگو شروع ہوتی ہے، تو سارا زور یہاں کے انفراسٹرکچر اور انتظامی نااہلی پر لگا دیا جاتا ہے۔ میری ذاتی رائے اس سے تھوڑی مختلف ہے۔ انفراسٹرکچر اور بلدیاتی مسائل اپنی جگہ موجود ہیں اور ان سے انکار ممکن نہیں، لیکن اس شہر کا سب سے بڑا اور بھیانک مسئلہ تعصب پرستی اور نفرت انگیزی ہے۔ ملک کے کسی دوسرے حصے یا شہر میں اگر کوئی مسئلہ یا جرم ہوتا ہے تو اس کی رپورٹنگ کا انداز بالکل عام اور پیشہ ورانہ ہوتا ہے، لیکن اگر وہی واقعہ کراچی میں پیش آ جائے تو میڈیا اور عوامی حلقوں میں اس مسئلے کو لسانی یا سیاسی رنگ دے کر، خوب نمک مرچ لگا کر رپورٹ کیا جاتا ہے۔ میں ایک تحقیقاتی صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی اس شہر کی ایک شہری یعنی" کراچی واسی" ہوں۔ اسی لیے میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ کراچی کے

رہائشیوں کے اپنے شہر کے بارے میں تجربات اور دوسرے شہروں میں رہنے والے لوگوں کی آراء میں بہت بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔

میں نے اس کتاب میں شہری انفراسٹرکچر پر اتنا زیادہ تذکرہ نہیں کیا، بلکہ شہر کے دیگر بہت سے ان دیکھے اور اچھوتے پہلوؤں کو شامل کیا ہے۔ میں تو کراچی کو ایک شہر نہیں بلکہ اپنے آپ میں ایک پورا" ملک" سمجھتی ہوں۔ میرے لیے یہ شہر ایک زندہ روح کی طرح ہے، ایک زندہ احساس اور ایک انوکھا جذبہ!

کتاب کا پہلا باب" اماں" اور کراچی کا کثیر الثقافتی رنگ

میری کتاب کا پہلا باب ایک" محبت نامہ" ہے، جس کا عنوان میں نے " اماں" رکھا ہے۔ جس طرح ایک ماں اور اس کے بچوں کا تعلق ہوتا ہے کہ ماں کبھی بچوں کی نادانیوں پر ناراض بھی ہوتی ہے، غصے میں مارتی بھی ہے، لیکن اس کے باوجود اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ جب ماں سے مار پڑتی ہے تو ہم وقتی طور پر ناراض ہو کر دور بھاگتے ہیں، لیکن آخر کار پلٹ کر اسی ماں کی محفوظ آغوش میں ہی پناہ لیتے ہیں۔ یہ شہر کراچی بھی میرے لیے بالکل ایک ماں جیسا ہی ہے۔ اس کتاب میں، میں نے ان بستیوں کی کچھ ایسی خوفناک اور سچی کہانیاں بھی رقم کی ہیں جن سے عام شہری واقف نہیں۔ آپ کو جب بھی موقع ملے، اسے ضرور پڑھیے گا۔

کتاب کے آخری باب میں، میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کوئی بھی شہر صرف چند سڑکوں، پتاجات (Addresses)، میدانوں یا نالوں کا نام نہیں ہوتا، بلکہ اس کے جغرافیے کے اندر ایک پوری بساط، ایک پورا ملک آباد ہوتا ہے۔ اس ایک کراچی کے اندر کئی اور شہر اور ان شہروں کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے قصبے آباد ہیں۔

اگر ہم اورنگی ٹاؤن کا رخ کرتے ہیں تو ہمیں وہاں ایک بڑی پشتون آبادی ملتی ہے جن کی اپنی ایک الگ سماجی دنیا ہے، اگر ہم لیاری چلے جائیں تو وہاں ایک روایتی بلوچی ثقافت کی دنیا آباد نظر آتی ہے؛، کیماڑی کی طرف نکلیں تو سندھی اور بلوچ مچھیروں کی مشترکہ بستیاں ملتی ہیں، اور جب ہم شہر کے وسطی علاقوں کا رخ کرتے ہیں تو وہاں اردو بولنے والے مہاجر آباد ہیں۔ میں نے ۲۵ سال اس شہر کی گلیوں میں صحافت کی ہے، لیکن آج بھی مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے اب تک مکمل کراچی نہیں دیکھا۔ اگر میں تاحیات اس شہر میں سفر کرتی رہوں، یہاں کے چپے چپے پر جا کر لوگوں سے بات کروں اور ان کے دکھ سکھ سنتی رہوں، تو شاید میری زندگی ختم ہو جائے گی لیکن اس شہر کی کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔

❁ الزامات کی سیاست بمقابلہ شواہد اور حقائق کی تلاش

شہریوں اور رائے عامہ بنانے والوں سے میرا ایک بڑا شکوہ یہ ہے کہ جب بھی ہم یہاں کے شہری ڈھانچے کے مسائل پر بات کرتے ہیں، تو ہم کبھی سنجیدہ اور تکنیکی سوالات نہیں پوچھتے، بلکہ صرف پکے پکائے الزامات لگا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان الزامات کی سچائی جاننے کے لیے گہری تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے، اور چونکہ ریسرچ ایک انتہائی باریک، دقیق اور وقت طلب کام ہے، اس لیے کوئی بھی اس طرف توجہ نہیں دیتا۔

مثال کے طور پر، جب بھی شہر کی سڑکوں کی بدحالی پر گفتگو ہوتی ہے، تو ہر شخص صرف یونیورسٹی روڈ کا رونا رونے لگتا ہے کہ یونیورسٹی روڈ اب تک نہیں بنا۔ میرا ایسے تمام لوگوں سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا آپ کو معلوم بھی ہے کہ کراچی کا کل رقبہ کتنے مربع کلومیٹر پر

محیط ہے؟ یہاں تک کہ اگر آپ بڑے بڑے صحافیوں سے بھی کراچی کا کل رقبہ پوچھ لیں، تو آدھے سے زیادہ صحافیوں کو اس کا علم ہی نہیں ہوگا۔ میرا دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی روڈ کی کل لمبائی کتنی ہے؟ یہ روڈ کہاں سے شروع ہو کر کس مقام پر ختم ہوتا ہے؟ جس کے نہ بننے پر ہم سب کا اجتماعی غم جاگ اٹھتا ہے۔

جب ہم شہری ڈھانچے پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کسی شہر کا بنیادی ڈھانچہ اصل میں ہوتا کیا ہے؟ وہ کس طرح ڈیزائن کیا جاتا ہے؟ اسے کس طرح تباہ کیا جا رہا ہے اور اس تباہی کو روکنے کا اصل انتظامی حل کیا ہے؟ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ شہر میں کل کتنی سڑکیں ہیں، ان کا نیٹ ورک کتنے کلو میٹر پر پھیلا ہوا ہے، اس وقت کن کن مقامات پر تعمیراتی کام جاری ہے، اور اس تعمیرات کے نتیجے میں کتنی آبادی براہِ راست متاثر ہو رہی ہے؟ کیا وہ بننے والی سڑک واقعی اس علاقے کی آبادی کی ٹریفک کی ضرورت کو پورا کر بھی رہی ہے یا نہیں؟

جب میں اس قسم کے ٹھوس اور تحقیقی سوالات سماجی رابطے کی ویب سائٹ فیس بک یا دیگر پلیٹ فارمز پر اٹھاتی ہوں، تو لوگ نیچے آ کر کمنٹس کرتے ہیں کہ ”آپ تو سندھ حکومت سے لفافہ لیتی ہیں“۔ اب اگر کسی کی سوچ ہی اتنی سطحی ہو تو میں اس کا نظریہ تبدیل نہیں کر سکتی، لیکن میں ہمیشہ حقائق پر مبنی گفتگو کرتی ہوں اور میرا کام ہی حقائق کو کھوج کر سامنے لانا ہے۔ کراچی جیسے دنیا کے اتنے بڑے میگاسٹی کے تمام مسائل کو صرف ایک یونیورسٹی روڈ کے بننے یا نہ بننے پر لا کر سمیٹ دینا (Conclude کرنا) اور یہ کہہ دینا کہ شہر میں کوئی کام ہی نہیں ہو رہا، اس شہر کے وسیع جغرافیے کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔

❁ سیوریج اور برساتی نالوں کا بنیادی فرق اور تجاوزات کا المیہ

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس شہر میں مسائل موجود نہیں ہیں۔ یہاں یقیناً سنگین مسائل ہیں۔ ہر سال بارشوں کے دوران نالے ابل پڑتے ہیں اور پورا شہر ڈوب جاتا ہے۔ لیکن کیا ہمیں یہ معلوم ہے کہ پورے شہر میں نالوں کا یہ نیٹ ورک کس طرح بچھایا گیا ہے؟ اور ان نالوں کی اقسام میں کیا فرق ہے؟ ہم عام طور پر جن نالوں کا رونا روتے ہیں، کیا وہ برساتی نالے (Stormwater Drains) ہیں یا وہ انسانی فضلے اور گٹر کے گندے پانی کے اخراج کے سیوریج نالے (Sewerage Lines) ہیں؟ ہمارے ہاں لوگوں کو ان دونوں نالوں کا بنیادی فرق تک معلوم نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ شہر میں کتنے بڑے نالے ہیں اور ان کے کتنے فیصد حصے پر یہ چوکنگ (Choking) کا مسئلہ آرہا ہے۔

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جہاں جہاں تجاوزات زیادہ ہیں، وہاں یہ مسائل بھی سب سے زیادہ شدید ہیں۔ میں خود کلفٹن کے علاقے ڈی ایچ اے (DHA) فیز 7 میں رہتی ہوں، جو خود سمندر کی زمین پر قبضہ کر کے (Reclamation کے ذریعے) بنایا گیا ہے۔ تو اصول کی بات یہ ہے کہ جب ہم قدرتی برساتی نالوں، دریا کے راستوں اور سیوریج کے پانی کی قدرتی گزرگاہوں پر قبضے کر کے بستیاں اور فیز بنائیں گے، تو پھر بارشوں میں پانی کا ہمارے گھروں میں داخل ہونا اور نالوں کا ابلنا ایک لازمی امر بن جاتا ہے۔ ہمیں ان مسائل کی جڑ کو سمجھنا ہوگا۔

اگر ہم ماضی کا پچھلا ریکارڈ اٹھا کر دیکھیں، تو سابق ناظم مصطفیٰ کمال صاحب کے دورِ حکومت میں بھی یہ شہر بارشوں میں مکمل طور پر ڈوب جایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آئی آئی

چندریگر روڈ پر برسات کا پانی اس حد تک جمع ہو جاتا تھا کہ ٹرک کے ٹرک اس میں ڈوب جاتے تھے اور کئی ہفتوں تک وہ مرکزی سڑکیں قابل استعمال نہیں رہتی تھیں۔

❁ پروین رحمان صاحبہ کی رہنمائی اور نالوں کا جیو-ٹیکنیکل المیہ

اسی زمانے میں، میں نے اورنگی پائلٹ پراجیکٹ (OPP) پر ایک تحقیقاتی اسٹوری کی تھی۔ اس وقت پروین رحمان صاحبہ (مرحومہ) حیات تھیں: جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے نقشوں کی مدد سے اس شہر کا پورا ڈرینج سسٹم سمجھایا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کراچی میں سات بڑے قدرتی نالے ہیں جہاں اصل تیکنیکی مسائل موجود ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب یہ نالے پورے شہر کا پانی سمیٹ کر" مائی کولاچی" کے مقام سے سمندر کی طرف بڑھتے ہیں، تو وہاں جا کر یہ انتہائی تنگ ہو جاتے ہیں۔ اب آپ خود سوچیے کہ جب پورے میگاسٹی کا پانی اس تنگ نکاس پر پہنچتا ہے، تو وہاں" بوٹل نیک" (Bottleneck) بننے کی وجہ سے سیلابی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔

اس انجینئرنگ فالٹ کے ساتھ دوسرا بڑا المیہ یہ ہے کہ ان نالوں کے اندر کچرا پھینک دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب برساتی نالوں میں پانی آتا ہے، تو وہ کچرے کی وجہ سے بلاک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ عام لوگ اکثر یہ شکایت کرتے ہیں کہ حکومت کچرا نہیں اٹھاتی جس کی وجہ سے یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ بالکل، حکومتی نااہلی اور غفلت اپنی جگہ حقیقت ہے، لیکن بطور شہری ہمیں خود سے بھی یہ سوال پوچھنا ہوگا کہ آخر وہ کچرا نالوں کے اندر آیا کہاں سے؟ کچھ چیزوں کے حوالے سے ہماری بھی سماجی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اپنے گھروں اور دکانوں کا کچرا ان نالوں میں نہ پھینکیں۔

❁ سالڈ ویسٹ مینجمنٹ کے مراحل اور صحافتی ناکامی

اگر ہم سائنسی اور انتظامی بنیادوں پر دیکھیں تو کسی بھی بڑے شہر میں کچرا تین بنیادی مراحل کے تحت ٹھکانے لگایا جاتا ہے:

❁ پہلا مرحلہ (Primary Collection): محلے اور گلی کی سطح سے کچرا اٹھانا۔

❁ دوسرا مرحلہ (Segregation & Recycling): کچرے کی چھانٹی کرنا، جس میں سے دوبارہ قابل استعمال (Recyclable) اشیاء کو الگ کیا جاتا ہے۔

❁ تیسرا مرحلہ (Final Disposal): باقی بچ جانے والے فضلے کو مخصوص گاربیج ٹرانسفر اسٹیشنز (GTS) کے ذریعے حتمی مقام پر لے جا کر تلف کرنا۔

لیکن بطور صحافی، ہم مسائل کی ان بنیادی وجوہات کو تلاش کرنے، ان کا حل بتانے اور عوام تک درست معلومات اور آگاہی پہنچانے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ میرا کام لوگوں کو معلومات فراہم کرنا ہے، لیکن اگر مجھے خود ہی یہ معلوم نہیں ہوگا کہ شہر میں کچرا ٹھکانے لگانے کا اصل طریقہ کار کیا ہے، اور میں بس مائیک پکڑ کر یہ کہہ دوں کہ شہر میں بہت کچرا ہے اور اس کا ذمہ دار میئر ہے، تو اس سطحی گفتگو سے کچھ تبدیل نہیں ہوگا۔

میئر یقیناً انتظامی طور پر جوابدہ ہے، لیکن کیا ہم نے کبھی یہ تحقیق کی کہ کراچی میں روزانہ کی بنیاد پر کلو یا ٹن کے حساب سے کتنا کچرا جمع ہوتا ہے؟ آیا یہ روزانہ 16 ہزار ملین ٹن ہے یا 18 ہزار ملین ٹن؟ کیا کچرا اٹھانے کے ان تینوں مراحل پر ٹھیک سے کام ہو رہا ہے؟ کراچی کا کچرا تلف کرنے کے لیے کل کتنی لینڈفل سائٹس (Landfill

Sites) ہیں؟ میری معلومات کے مطابق، اتنے بڑے شہر کے لیے صرف دو آفیشل جگہیں (جام چا کرو اور گوند پاس) موجود ہیں۔ بطور صحافی ہمیں یہ سوال اٹھانا چاہیے کہ کیا یہ کچرا وہاں سائنسی طریقے سے تلف کیا بھی جارہا ہے یا نہیں؟ وہ زمینیں کس کی ہیں؟ کچھ عرصہ قبل جب سندھ حکومت نے ان سائٹس کا کرایہ ادا نہیں کیا، تو مالکان نے آپریشن روک دیا اور کہا کہ اپنا کچرا اپنے پاس رکھیں، نتیجتاً وہ سارا کچرا ہمیں شہر کی سڑکوں پر پڑا ہوا نظر آیا۔ اسی لیے میں کہتی ہوں کہ سطحی نعرے بازی کے بجائے سوال ضرور پوچھیں اور تحقیق لازمی کریں۔ جب آپ گہری تحقیق کریں گے، تو اس شہر کی ریت میں دفن ہزاروں کہانیاں آپ کے سامنے خود بخود آشکار ہو جائیں گی۔

۞ منظم جرائم (Organized Crimes)، مافیاز اور سیاسی گٹھ جوڑ

تجاوزات اور چائنا کٹنگ کے حوالے سے بات کی جائے تو دنیا بھر کے بڑے شہروں میں منظم جرائم کے باقاعدہ ادارے اور نیٹ ورکس کام کرتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں بھی اس کا بہت تفصیلی ذکر کیا ہے کہ کس طرح یہ منظم جرائم اور مافیاز اس شہر کی سمت اور جغرافیے کا تعین کرتے ہیں اور اس کے پیچھے کون سے طاقتور لوگ شامل ہیں۔ یہ لینڈ مافیاز اور واٹر مافیاز دنیا کے دیگر بڑے شہروں کی طرح یہاں بھی ایک فرنچائز کے طور پر سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں۔

میں جس زمانے میں فیلڈ رپورٹنگ کرتی تھی، تب کا ایک آنکھوں دیکھا سچ بتاتی ہوں؛ جب بھی کسی سیاسی جماعت کو کسی نئے علاقے پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنا یا قبضہ کرنا ہوتا تھا، تو وہ اس علاقے کے نامی گرامی مجرموں اور مافیاز کو اپنی پارٹی کا جھنڈا تھما دیتے تھے۔ وہ مجرم اس زمین پر پارٹی کا جھنڈا لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور پھر وہاں سے

پرُانی آبادیوں کو بے دخل کر کے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

میں نے اپنی کتاب میں زیادہ تر اورنگی ٹاؤن اور لیاری کے زمینی حالات کا ذکر کیا ہے۔ ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ ماضی میں اورنگی میں کس کا سیاسی غلبہ تھا، اور لیاری، کیماڑی یا شہر کے وسطی علاقوں (ڈسٹرکٹ سینٹرل) پر کس سیاسی پارٹی کا کنٹرول تھا۔ انہی سیاسی پارٹیوں کی مکمل سرپرستی اور ملی بھگت سے سرکاری زمینوں پر قبضے ہوئے، اور انہوں نے ہی اپنے ذاتی و سیاسی مفادات کے لیے اس شہر کے ماسٹر پلان اور شہری ڈھانچے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

آخر میں بس یہی کہوں گی کہ میرے لیے تو یہ شہر ایک " آغوشِ مادر" (ماں کی گود) کی طرح ہے، لیکن شہر کو برباد کرنے والے ان مفاد پرست عناصر کے لیے یہ کراچی محض ایک کیک کی مانند ہے، جس میں سے ہر مافیا اور ہر سیاسی جماعت چُھری چلا کر اپنا اپنا حصہ بٹورنے میں مصروف ہے۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ!

زاہد فاروق: بہت شکریہ، سبین آغا صاحبہ! آپ نے اپنے ۲۵ سالہ صحافتی کیریئر کے نچوڑ اور گراں قدر تجربات کو یہاں موجود سابقہ بیوروکریٹس، سینئر صحافیوں، سماجی کارکنان اور خاص طور پر جامعہ کراچی کے شعبۂ عمرانیات کے طلبہ کے گوش گزار کیا۔ یقیناً اس ہال اور آن لائن فورم میں موجود ان تمام افراد کا تعلق بھی کراچی کے انہی مختلف اور دور دراز علاقوں سے ہے جن کے تنوع، ثقافت اور مسائل کا ذکر آپ نے ابھی اپنی گفتگو میں کیا۔ آپ کی یہ بات سو فیصد درست اور علمی لحاظ سے بالکل بجا ہے کہ کسی بھی انتظامی ڈھانچے پر شکوہ یا تنقید کرنے سے پہلے ہمیں حقائق کی گہرائی میں جانا چاہیئے اور تحقیق کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ

معاشرے میں ریاست کا درجہ ایک ماں جیسا ہوتا ہے؛ اور اولاد کو جب بھی کوئی تکلیف، دکھ یا شکایت ہو تو وہ پلٹ کر اپنی ماں کے سامنے ہی دامن پھیلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس شہر کے باسی پبلک ٹرانسپورٹ، ٹوٹی ہوئی سڑکوں، پانی کی قلت اور دیگر بنیادی بلدیاتی مسائل سے عاجز آجاتے ہیں، تو وہ اپنے مروجہ حق کے تحت حکومتِ وقت اور مقتدر اداروں سے ہی شکوہ اور احتجاج کرتے ہیں۔ اب اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے میں، اربن ریسورس سینٹر کے چیئرمین، محترم جناب عارف حسن صاحب کو گفتگو کی دعوت دیتا ہوں، جو کراچی کے شہری مسائل، یہاں کی تاریخ، اس کی ڈیموگرافی اور انفراسٹرکچر کی تیکنیکی و سماجی باریکیوں پر دنیا بھر میں ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں عارف حسن صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ آج کے موضوع کے حوالے سے اپنے خیالات، مشاہدات اور ریسرچ شیئر کریں۔

عارف حسن: بہت شکریہ سبین! آپ نے اپنے صحافتی تجربات کا نچوڑ نہایت خوبصورتی سے ہمارے سامنے رکھا۔ بطور صحافی آپ کا مشاہدہ اور گفتگو واقعی بہت جاندار تھی۔ مجھے اس شہرِ بے کنار (کراچی) کی سماجی و تیکنیکی ساخت کو سمجھنے، اس کی تعمیر و ترقی پر ریسرچ کرنے اور دنیا بھر کے مختلف فورمز پر اس کی نمائندگی کرتے ہوئے تقریباً ۵۰ سال ہو چکے ہیں۔ اپنے اس نصف صدی کے تجربے اور مشاہدات کو اگر میں مختصراً بیان کروں، تو میرا یہ پختہ ایمان ہے کہ کسی بھی علاقے کے زمینی حقائق اور وہاں کے مسائل کو صرف اور صرف وہاں کا مقامی رہائشی ہی صحیح معنوں میں سمجھ سکتا ہے۔ آپ کسی بھی شہر کے بارے میں تب تک کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کے مسائل کا حل نکال سکتے ہیں، جب تک آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس شہر کی گلیوں اور کوچوں میں: کون کیا

کرتا ہے؟ کیوں کرتا ہے؟ کہاں کرتا ہے؟ اور کس طرح کرتا ہے؟ جب آپ سماج کے نچلے طبقے سے جڑے ان بنیادی سوالات کو گہرائی سے سمجھیں گے، تب ہی آپ حقیقی معنوں میں شہر کے ڈھانچے کو سمجھ پائیں گے۔

❁ تاریخی ماسٹر پلانز کے مفروضے اور زمینی حقائق کا تضاد

میں آپ کو کراچی کی تاریخ سے ایک مثال دیتا ہوں۔ اس شہر کے پہلے ماسٹر پلان میں یہ تخمینہ اور مفروضہ لگایا گیا تھا کہ سن ۲۰۱۰ تک کراچی کی کل آبادی محض تین (3) ملین ہوگی، جبکہ حقیقت میں یہاں کی آبادی اس اندازے سے دوگنا سے بھی کہیں زیادہ تجاوز کر چکی تھی۔ اسی طرح جب گریٹر کراچی ری سیٹلمنٹ پلان (Greater Karachi Resettlement Project) بنایا گیا، تو اس کا ایک بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ شہر کے دور دراز علاقوں جیسے لانڈھی اور کورنگی میں بڑی انڈسٹریز (صنعتی زون) لگا کر ترقی کا عمل تیز کیا جائے گا اور کچی آبادیوں کے لوگ وہاں جا کر ان فیکٹریوں میں کام کریں گے۔ لیکن یہ مہا کایاں منصوبہ بھی بری طرح ناکام ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منصوبہ سازوں نے غریب عوام کے لیے رہائشی آبادیاں تو بنا دیں مگر وہ شہر کے مرکزی تجارتی مراکز سے اس قدر دور تھیں اور وہاں تک رسائی کے لیے سڑکوں اور پبلک ٹرانسپورٹ کا انفراسٹرکچر سرے سے ڈیزائن ہی نہیں کیا گیا تھا کہ غریب مزدوروں کے لیے وہاں آسانی سے آنا جانا ممکن ہوتا۔ اس پورے عمل میں نہ تو کوئی شفافیت تھی، نہ ٹھوس منصوبہ بندی اور نہ ہی قوانین کو بہتر انداز میں لاگو کیا گیا تھا۔

ان تمام ناکامیوں کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے منصوبہ ساز اداروں اور عام عوام کے درمیان کسی قسم کا کوئی رابطہ، مکالمہ یا ہم آہنگی موجود نہیں تھی۔ ہمارے

ایلیٹ کلاس ٹاؤن پلانرز کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اس شہر کے حقیقی مسائل کیا ہیں؛ انہوں نے صرف ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر ہوائی باتیں کیں اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک کا طریقہ کار اور ماڈلز یہاں زبردستی رائج کرنے کی کوشش کی۔ میں آپ کو پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ماضی میں ہونے والا یہ کام کسی بھی طرح اس شہر کے لیے فائدہ مند ثابت نہیں ہوا۔ ماضی کے فرسودہ طریقوں کو اندھا دھند اپنانے سے قبل مقامی مسائل کی نوعیت کو سمجھنا لازمی ہے، ورنہ یہ بیرونی ماڈلز حل بننے کے بجائے خود ایک مستقل مسئلہ بن جاتے ہیں اور آپ کو نئی سوچ اور جدید بلدیاتی حل تلاش کرنے سے روک دیتے ہیں۔

سالڈ ویسٹ مینجمنٹ اور نالوں کی بلاکیج

کچرے کے حوالے سے جو بات سبین نے کی، وہ بالکل درست ہے۔ جب تک ہم کچرے کو سائنسی بنیادوں پر ٹھکانے لگانے کا ایک باقاعدہ اور مربوط نظام (Comprehensive Solid Waste Management System) نہیں اپنائیں گے، تب تک آپ کو شہر کے برساتی اور سیوریج نالوں میں جگہ جگہ اسی طرح کچرے کے ڈھیر نظر آتے رہیں گے اور ہر بارش میں شہر ڈوبتا رہے گا۔ اس کے لیے نچلی سطح پر مانیٹرنگ کی ضرورت ہے۔

زمینوں پر قبضے (Land Issues) اور ریاستی سرپرستی کا سچ

جہاں تک زمینوں پر غیر قانونی قبضے اور تجاوزات کا تعلق ہے، تو اورنگی پائلٹ پراجیکٹ (OPP) میں میرا 30 سالہ تجربہ ہے کہ اس شہر میں حکومت اور متعلقہ اداروں کی اندرونی منظوری، چشم پوشی یا آشیرباد کے بغیر ایک گز زمین پر بھی کوئی قبضہ نہیں کر سکتا۔ کچی آبادیوں کے غریب لوگ تو محض اپنے سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈتے ہیں،

اصل اور بڑے بڑے قبضے تو اس شہر کے بااثر اور طاقتور لوگ (Land Grabbers) کرتے ہیں، جن کا شہری منصوبہ سازی یا قواعد وضوابط سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ اس حساس موضوع پر میں مستقل لکھتا رہتا ہوں۔ اگر کسی کو اس مافیا کے طریقہ کار کو سمجھنے میں دلچسپی ہو، تو میری ایک کتاب کراچی: دی لینڈ ایشو (Karachi:The Land Issue) موجود ہے، جس میں، میں نے زمینوں سے غریبوں کو بے دخل کرنے والے بااثر عناصر کی پوری تفصیلات اور اس مافیا کے ہاتھوں قتل ہونے والے 11 بے گناہ لوگوں کے نام مع ثبوت شامل کیے ہیں۔ یہ ایک انتہائی منظم اور عالمی سطح کا مافیا ہے جو اپنے مفادات کے آڑے آنے والے ہر شخص کو ڈراتا، دھمکاتا اور راستے سے ہٹا دیتا ہے۔

❁ اداروں کی اصلاح کا اصل طریقہ

میرا یہ ماننا ہے کہ اگر ہم واقعی کراچی کے ان دیرینہ مسائل کو ختم کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں بلدیاتی اور انتظامی اداروں کے بنیادی ڈھانچے (Institutional Infrastructure) پر نئے سرے سے کام کرنا ہوگا۔ اور یاد رکھیے، ادارے صرف چند انسانوں کو ادھر سے ادھر بدل دینے یا تبادلے کر دینے سے نہیں بنتے بلکہ ادارے ہمیشہ مقامی لوگوں کی شمولیت، وقت کی انویسٹمنٹ، مسلسل تربیت اور اعلیٰ تعلیم و تیکنیکی مہارت سے پروان چڑھتے ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ اگر ہم نے خلوصِ نیت کے ساتھ مقامی آبادیوں کو فیصلہ سازی میں شامل کیا، تو آنے والے وقت میں اس شہر کے بلدیاتی وشہری مسائل ضرور حل ہوں گے اور کراچی کے حالات میں ایک نمایاں بہتری آئے گی۔ آپ سب کا بہت شکریہ!

سوالات و جوابات سیشن

زاہد فاروق : آپ سب نے میڈم سبین آغا اور محترم عارف حسن صاحب کی گفتگو انتہائی توجہ سے سنی۔ ہم سب اسی شہرِ کراچی کے باسی ہیں اور اس کے روزمرہ کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے علاقوں میں کتنے دن پانی آتا ہے، روزانہ اس شہر میں کتنا ٹن کچرا پیدا ہوتا ہے، یہاں کی کتنی سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں اور ان پر چلنے والی ٹرانسپورٹ کی کیا حالت ہے۔ ہم میں سے اکثریت ان زمینی حقائق کا روز کاٹتی ہے۔ آج شہر کی نبض کو جاننے والی دو اہم شخصیات ہمارے سامنے موجود ہیں۔ میں ہال میں موجود شرکاء کو دعوت دیتا ہوں کہ اگر وہ کوئی سوال پوچھنا چاہیں، تو مائیک سنبھال سکتے ہیں۔

ثمینہ حسن (فائن آرٹسٹ و ریسرچ اسسٹنٹ): سبین آغا صاحبہ نے اپنی گفتگو میں تعصب کی بات کی، تو یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنتے ہیں کہ کراچی بالکل تباہ و برباد ہوگیا لیکن اس کے باوجود یہ میگا سٹی پورے پاکستان میں سب سے زیادہ ریونیو (Revenue) جنریٹ کر کے دے رہا ہے۔ سبین صاحبہ کا صحافت کے میدان میں ۲۵ سالہ وسیع تجربہ ہے۔

۞ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ ہمارا مین اسٹریم میڈیا (Mainstream Media)، ڈیجیٹل کنٹینٹ رائٹرز، وی لاگرز اور ذمہ دار صحافی کراچی کی اس بربادی یا ترقی کا بیانیہ (Narrative) بنانے میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟ یہ شہر 1980 اور 1990 کی دہائی سے لے کر بعد تک لسانی اور سیاسی آگ میں جلتا رہا ہے۔ اگر

ماضی کو دیکھیں تو ریاست نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ذریعے اب جا کر کسی حد تک اپنی رٹ (Writ of State) قائم کی ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ریاست یہ رٹ پہلے قائم نہیں کر سکتی تھی؟ یا جان بوجھ کر کراچی کو ایسے بدترین حالات تک پہنچایا گیا؟

۞ میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ اب میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ذریعے منظم طریقے سے لوگوں کا نظریہ اور سوچ (Perception) تبدیل کی جا رہی ہے۔ حال ہی میں، میں ایک ویڈیو دیکھ رہی تھی جس میں سی ویو (Sea View) کا ساحل دکھایا جا رہا تھا۔ سی ویو ایک پبلک بیچ (عوامی ساحل) ہے، لیکن وہاں بننے والے کسی ریزورٹ کی وجہ سے اسے ویڈیو میں نجی ساحل (Private Beach) کہہ کر پیش کیا گیا۔ کوئی بھی قدرتی ساحل کسی کی ذاتی ملکیت کیسے ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے میڈیا پروپیگنڈا اور عوامی مقامات پر قبضے کے بیانیے کے حوالے سے آپ کیا کہیں گی؟

سبین آغا: میں نے آپ کے دونوں سوالات بہت غور سے سنے ہیں اور ان کا لبِ لباب دو چیزیں ہیں:

پہلا یہ کہ میڈیا اور صحافی ذمہ دارانہ کرداریوں نہیں ادا کر رہے؟

دوسرا یہ کہ عوام کی سوچ اور نظریے کو کس طرح تبدیل (Perception Management) کیا جا رہا ہے؟

میں نے اپنی پہلی گفتگو میں بھی یہ واضح کیا تھا کہ اس شہر کے حوالے سے کی جانے والی موجودہ صحافت کا ایک بڑا حصہ متعصب ہے اور اس کام کے لیے باقاعدہ منظم طریقے سے فنڈنگ کی جاتی ہے۔ ڈیجیٹل میڈیا کا یہ المیہ ہے کہ اگر کوئی کنٹینٹ

کریئٹر (Content Creator) اچھی اور ریسرچ پر مبنی گفتگو کرے، سنجیدہ سوالات اٹھائے، تو اسے وہ ویوز اور مالی فائدہ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس، جب وہ ایسا مواد تیار کرتے ہیں جس میں صرف سنسنی خیزی اور شہر کے منفی پہلو نمایاں ہوں، تو وہ عوام کی توجہ بہت جلدی حاصل کر لیتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جنوبی ایشیا کے لوگ جبلت اور نفسیات کے لحاظ سے بہت جذباتی ہوتے ہیں، اسی لیے ان کے جذبات کو بھڑکا کر ویوز بٹورے جاتے ہیں۔

آج کل جو لوگ سوشل میڈیا پر مواد بنا رہے ہیں، ان میں سے اکثریت کا کل وقتی صحافت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ اگر ہر دوسرا شخص خود کو صاحبِ اثر (Influencer) گرداننے لگے یا رائے ساز کا لیبل لگا لے گا، تو وہ معاشرے پر کس قسم کے اثرات مرتب کر رہا ہے؟ ہمیں یہ ادراک ہونا چاہیے کہ حقائق پر مبنی معلومات صرف مکمل ریسرچ اور فیکٹ چیکنگ کے بعد ہی منظرِ عام پر آتی ہیں۔

جہاں تک نظریہ تبدیل کرنے کا تعلق ہے، تو یہ ایک منظم صنعت بن چکی ہے۔ ان انفلوئنسرز کو باقاعدہ تیار اسکرپٹس (Scripts) دیے جاتے ہیں اور یہ اسکرپٹس کہاں سے اور کن ایجنڈوں کے تحت آتے ہیں، یہ ہم سب بخوبی جانتے ہیں۔ عارف حسن صاحب نے جن مافیاز اور عوامل کا تذکرہ کیا، وہ سب اس کھیل میں شامل ہیں کیونکہ شہر کا یہ منفی تاثر ان طاقتور عناصر کے حق میں جاتا ہے۔ ہر دور میں عوام کو فکری گمراہی کا شکار کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتے رہے ہیں، اور آج کے دور کا سب سے بڑا حربہ یہی سوشل میڈیا کے خود ساختہ رائے ساز ہیں۔

میڈیا کے پاس یہ طاقت ہمیشہ سے رہی ہے کہ وہ کسی بھی بیانیے کو عوام کے ذہنوں

میں راسخ کردے یا مٹادے۔میڈیا چاہے تو ماضی کے کسی بڑے ہیرو کو زیرو بنا کر پیش کردے اور اگر چاہے تو آج کے کسی زیرو کو کل کا ہیرو بنا کر مارکیٹ کردے۔

میں آپ کو اس سطحی اور بغیر ریسرچ کے کام کی ایک تازہ اور مضحکہ خیز مثال دیتی ہوں۔حال ہی میں کراچی میں ایک واقعہ ہوا، میں نے اس پر ایک پوسٹر ڈیزائن کر کے فیس بک پر اپ لوڈ کیا۔اسے دیکھ کر ایک موصوف نے اپنی پوری ٹیم کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا اور کہنے لگے،، ہم کراچی کے زمینی حقائق پر ایک شارٹ فلم بنانا چاہتے ہیں، آپ اپنا نمبر دیں تا کہ ہم بات کرسکیں۔میں نے پوچھا کہ بھائی، آپ کی شارٹ فلم سے میرا کیا تعلق؟ تو کہنے لگے، ہم دراصل ایک ویب سائٹ بنا رہے ہیں جہاں ہم کراچی پر لکھی گئی آپ کی کتاب اپ لوڈ کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے ان سے سیدھا سوال کیا، کیا آپ نے یا آپ کی ٹیم کے ہیڈ نے میری وہ کتاب پڑھی بھی ہے؟ وہ صاحب جھینپ کر کہنے لگے، بدقسمتی سے میں نے تو نہیں پڑھی، لیکن جو صاحب اس پروجیکٹ کو ہیڈ کر رہے ہیں، شاید انہوں نے پڑھی ہو۔میں نے کہا کہ آپ پہلے ان سے معلوم کرلیں، پھر ہم اس پر کوئی علمی مذاکرہ یا بات چیت کریں گے۔کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ ان کے ہیڈ کی کسی سہیلی نے انہیں میری کتاب کے بارے میں بتایا تھا، جس پر انہوں نے فلم بنانے کا سوچ لیا۔قصہ مختصر، جب میں نے اصرار کیا تو آخری جواب مجھے یہ ملا، میڈم! کیا یہ بات آپ ہمارے ہیڈ کو خود فون کر کے کہہ سکتی ہیں؟ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ان کے پاس آپ کی کتاب پڑھنے کا بالکل وقت نہیں ہے۔

آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ جو لوگ عوام کے لیے فلمیں، وی لاگز یا مواد بنا رہے ہیں، ان کا اپنا یہ حال ہے کہ نہ وہ پڑھنا چاہتے ہیں اور نہ ہی ریسرچ کرنے کی زحمت کرتے

ہیں۔تو پھر وہ خاک اچھا مواد تیار کریں گے؟ اب خبریں اور کہانیاں فیلڈ سے تلاش نہیں کی جاتیں بلکہ ڈیسک پر بیٹھ کر خود تیار کی جاتی ہیں۔ سنسنی خیزی (Sensationalism) نے حساسیت کی جگہ لے لی ہے۔میں نے بھی ان صاحب کو دوٹوک جواب دیا کہ آپ کی اتنی جرات کہ آپ کے پاس کتاب پڑھنے کا وقت نہیں ہے، لیکن آپ اس کی مصنفہ کو اپنے پروجیکٹ میں شامل کرنے کے لیے وقت مانگ رہے ہیں! یہ ہمارے میڈیا اور مواد تخلیق کرنے والوں (Content Creators) کا اصل چہرہ اور تلخ حقیقت ہے۔

زاہد فاروق: آپ نے کراچی کے ساحل سمندر کے عوامی ساحل ہونے کے حوالے سے جو پروپیگنڈا اور نجکاری کی بات کی ہے، اس کے تاریخی پس منظر کے بارے میں شرکاء کو ایک بہت اہم حقیقت بتانا چاہوں گا۔

بات یہ ہے کہ سال 2003 یا 2004 کے دوران، جب جنرل پرویز مشرف صاحب کا دورِ حکومت تھا، اس وقت کلفٹن سی ویو کے اس پورے ساحل کو کمرشلائز کر کے ایک غیر ملکی کمپنی کے حوالے کیا جا رہا تھا، یعنی اس کی مکمل نجکاری (Privatization) کی تیاری تھی۔اس سنگین موقع پر، ہمارے محترم جناب عارف حسن صاحب کی سربراہی میں کراچی کے لیے دردِ دل رکھنے والے بزرگ شہریوں، ریٹائرڈ ججز، سول سوسائٹی کے سرگرم ارکان اور ہمارے صحافی دوستوں نے مل کر ایک طویل اور انتھک جدوجہد کا آغاز کیا۔

آج ہمیں سی ویو کا مک ڈونلڈز سے لے کر کلاک ٹاور تک کا جو کھلا ساحل نظر آتا ہے، جہاں کراچی کا ہر عام و خاص شہری بغیر کسی فیس یا پابندی کے تفریح کے لیے جاتا ہے، یہ اسی تاریخی سول سوسائٹی تحریک، عدالتی چیلنجز اور احتجاجی ریلیوں کا براہِ راست نتیجہ

ہے۔اس عوامی مزاحمت کے دوران اس وقت کے مقتدر حلقوں اور پس پردہ کام کرنے والی طاقتوں کی جانب سے عارف صاحب اور دیگر ساتھیوں کو شدید دھمکیاں بھی دی گئیں،لیکن ان تمام تر خطرات کے باوجود کراچی کے مخلص شہریوں نے اپنے ساحل کا سودا نہیں ہونے دیا اور اسے نجی کمپنیوں کے چنگل سے بچا کر ہی دم لیا۔

چنانچہ آج یہ عوامی ساحل جتنا بھی بچا ہوا ہے،یہ اس شہر کے شہریوں کی بیداری، پرامن جدوجہد اور ان کے اجتماعی مان کا ایک زندہ ثبوت ہے، جسے کسی کو بھی نجی ملکیت کہہ کر ہڑپ کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

سابق سرکاری افسر: زاہد فاروق صاحب نے سی ویو کے حوالے سے جو گفتگو کی، میں اس میں اپنے ۳۳ سالہ سرکاری ملازمت کے تجربے کی بنیاد پر ایک اہم ریکارڈ کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔مشرف دور میں جب اس ساحل کی نجکاری کی جارہی تھی،تو مجھے اسلام آباد سے اعلیٰ حکومتی نمائندوں کی باقاعدہ کال آئی کہ ہم یہ پروجیکٹ کرنے جارہے ہیں اور آپ اس سلسلے میں تعاون کریں۔اس منصوبے کے لیے دبئی سے لم گلاس کمپنی (Lam Glass Company) کی ایک خصوصی ٹیم کراچی آئی۔ہم نے سرکاری محکمے کی طرف سے انہیں تمام مطلوبہ ڈیٹا اور معلومات اکٹھی کر کے دیں۔

اس کے بعد جوائنٹ وینچر کی منصوبہ سازی ہوئی،لیکن جب آخری مراحل میں حتمی معاہدے پر دستخط ہونے تھے،تو میں نے اپنے ضمیر اور شہر کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔اس انکار کی چند بڑی تیکنیکی وجوہات تھیں:

۞ دبئی کی کمپنی اس ساحلی پبلک پراپرٹی میں 51 فیصد ملکیتی حصہ (Share) مانگ رہی تھی، جبکہ حکومتِ پاکستان کے پاس صرف 49 فیصد حصہ رہ جاتا۔

۞ معاہدے کی رو سے ساحل کے تمام انتظامی اور تزویراتی فیصلوں کا کلی اختیار (Absoluteالتحکم) دبئی کی کمپنی کے پاس چلا جاتا۔

ان پبلک انٹرسٹ کے خلاف شقوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے دستخط نہیں کیے، جس کے نتائج اور تادیبی کارروائی بھی مجھے اس وقت بھگتنی پڑی۔ بہرحال، یہ تمام تر تجاویز اور پیشکشیں بالاخر سال 2008 میں مکمل طور پر ختم ہوگئیں اور پھر اس پر دوبارہ بات نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر عاطف سعید (BMDRC): سبین صاحبہ! میں نے تاحال آپ کی کتاب نہیں پڑھی۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے اپنی اس کتاب کے اندر کراچی کے بلدیاتی مسائل پر طبی اعتبار (Medical&Public Health Perspective) سے کوئی تنقید کی ہے؟ مثال کے طور پر، ایک صحت مند جسم اور سوسائٹی کے لیے صحت مند طرزِ زندگی اور انفراسٹرکچر کا ہونا ضروری ہے۔ کیا اس حوالے سے کتاب میں کوئی باب ہے یا مستقبل میں آپ کا ایسا کوئی تحقیقی ارادہ ہے جس سے میڈیکل کمیونٹی کو مدد مل سکے؟

سبین آغا: ڈاکٹر صاحب! بنیادی طور پر یہ کتاب میری ذاتی اور صحافتی یادداشتوں پر مبنی ہے، اس لیے اس میں شہری ساخت یا پبلک ہیلتھ کے معاملات کا اس طرح تذکرہ نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کو بتاتی چلوں کہ میں نے صحت کے شعبے پر بہت کام کیا ہے۔ جب میں جیو نیوز (Geo News) کے تحقیقاتی سیل سے وابستہ تھی، تو میں نے کراچی کے تینوں بڑے سرکاری اسپتالوں: جناح اسپتال (J P M C)، سول اسپتال، اور عباسی شہید اسپتال کے انفراسٹرکچر اور وہاں دی جانے والی ناگفتہ بہ سہولیات پر تفصیلی تحقیقاتی رپورٹس کی تھیں۔ ہمارے سینیئر صحافی کامران خان صاحب کا

کام کرنے کا ایک مخصوص انداز تھا، وہ زیادہ سے زیادہ حقائق عوام کے سامنے لانا چاہتے تھے، چنانچہ میں نے ان اسپتالوں کی تیکنیکی خامیاں آشکار کیں۔

اس کے علاوہ، میں نے پبلک ہیلتھ بالخصوص پولیو کے پھیلاؤ کے موضوع پر کئی دستاویزی فلمیں بنائی ہیں۔ ان میں سے میری ایک انویسٹی گیٹو فلم کا انتخاب آسکرز (Oscars Nomination) کی دوڑ کے لیے بھی ہوا تھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کراچی طویل عرصے تک دنیا بھر میں پولیو وائرس کا گڑھ رہا ہے۔ اس حوالے سے ڈسٹرکٹ ویسٹ کی (UC-4) اور گجر نالہ کی آبادیاں عالمی سطح پر مانیٹر ہوتی تھیں۔ جب بھی پولیو کے حوالے سے کوئی بین الاقوامی اجلاس ہوتا، تو یوسی-4 کے ماحولیاتی نمونوں کا خصوصی طور پر پوچھا جاتا تھا۔ میں نے اس ہیلتھ کرائسز پر فلمیں تو بہت بنائیں لیکن کتاب میں اس کا ذکر نہیں، البتہ مستقبل میں اس پر لکھنے کا میرا ارادہ ضرور ہے۔

شجاع الدین قریشی: کراچی میں کئی مضافاتی آبادیاں بنیادی انسانی سہولیات سے یکسر محروم ہیں۔ بلوچستان کی سرحد پر واقع مچھیروں کا قدیم گاؤں مبارک ولیج اس کی بدترین مثال ہے، جہاں آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے لیکن تاحال وہاں بجلی موجود نہیں۔ دوسری طرف، سی ویو کا ساحل ہمیں چمکتا ہوا اس لیے نظر آتا ہے کیونکہ وہاں امیر لوگ رہتے ہیں۔ ماضی میں گزری کے مقامی مچھیرے اپنے روزگار کے لیے سی ویو کے ساحل پر مچھلی کا شکار کرتے تھے، لیکن ڈی ایچ اے (DHA) نے ان کے داخلے اور شکار پر پابندی لگا دی۔ ہم نے اس کے خلاف مچھیروں کے احتجاج کی بھرپور حمایت کی، مگر طاقتور حلقوں نے پابندی نہیں ہٹائی۔ اب عام شہریوں کے لیے ساحل نجی کیسے جا رہے ہیں۔

میرا سوال یہ ہے کہ چند ماہ قبل کراچی میں ایک معصوم بچہ کھلے گٹر میں گر کر جاں بحق ہوا، میڈیا نے اسے ہائپ تو دی لیکن یہ انتظامی مسئلہ مستقل حل نہیں ہوا، کیونکہ لگتا ہے کراچی کو کوئی اپنا نہیں سمجھتا۔ دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ آج صبح کے اخبار کے مطابق لاہور انتظامیہ تمام پرانی سڑکوں اور تاریخی مقامات کے پرانے نام بحال کر رہی ہے، لیکن کراچی کے اولڈ سٹی ایریا میں الٹ ہوا۔ یہاں کی تاریخی سڑکوں کے نام بدل دیے گئے، جیسے پرانا نام مٹا کر الطاف حسین روڈ رکھ دیا گیا مگر کسی کو پرانا نام معلوم ہی نہیں۔ ہمارا میڈیا ان تاریخی ناموں اور ثقافت کی بحالی کے لیے اپنا کردار کیوں ادا نہیں کرتا؟

سبین آغا: آپ خود بھی اس فیلڈ سے ہیں اور جانتے ہیں کہ مین اسٹریم میڈیا اس لیے کردار ادا نہیں کرتا کیونکہ اس میں ان کا کوئی کمرشل فائدہ یا ریٹنگ نہیں ہے۔ اگر کسی تاریخی سڑک کا نام تبدیل ہو جائے، تو اس سے میڈیا ہاؤسز کو کیا مالی فائدہ ہوگا؟ بدقسمتی سے ہمارے میڈیا میں اب یہ تربیت (Training) ہی ختم کر دی گئی ہے کہ ہم صحیح سوال پوچھیں، چیزوں کے تاریخی پس منظر کو دیکھیں اور معلوم کریں کہ آیا یہ تبدیلیاں قانوناً درست ہیں یا نہیں؟

دوسری بات یہ کہ ہم ہر انتظامی معاملے میں پنجاب یا لاہور کی طرف کیوں دیکھتے ہیں کہ اگر وہاں کوئی اچھا کام ہو رہا ہے تو وہ یہاں بھی ہو۔ ہمیں موازنے کے بجائے خود اپنے شہر کے لیے حقیقی تبدیلی کا قدم اٹھانا ہوگا۔

جہاں تک سڑکوں اور عمارتوں کے پرانے نام تبدیل کرنے کا تعلق ہے، تو نام کسی بھی شہر کی تاریخی میراث (Heritage) اور ثقافت ہوتے ہیں۔ میری ذاتی اور علمی رائے میں ناموں کی یہ جبری تبدیلی دراصل ایک قسم کی نظریاتی شدت پسندی ہے۔

ہمارے ہاں پرانی سڑکوں، باغوں اور تاریخی عمارتوں کے نام تبدیل کر کے انہیں زبردستی ایک مخصوص مذہب کا لبادہ اوڑھایا جارہا ہے، جوکہ ہماری جڑوں کو کاٹنے کے مترادف ہے۔ مثال کے طور پر: " پٹیل پارک" کا تاریخی نام تبدیل کر کے نشتر پارک کھ دیا گیا۔ " رام باغ" کا نام بدل کر آرام باغ کر دیا گیا۔ اسی طرح بے شمار ہندو اور پارسی ناموں کو مٹا کر ان کا زبردستی اسلامی چہرہ بنانے کی کوشش کی گئی، یہ وہ شدت پسندی ہے جو ہمارے معاشرے کی رگوں میں سرائیت کر چکی ہے۔

چونکہ میڈیا پر کام کرنے والے لوگ بھی اسی سوسائٹی کا حصہ ہیں، اس لیے ان کی سوچ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ حالانکہ صحافیوں کا کام کسی ایجنڈے کے بغیر صرف غیر جانبدارانہ صحافت کرنا ہے۔ اگر ہمارے رپورٹرز صحافت کے بنیادی 5W 1H فارمولے (How, Why, Where, When, What,Who) کے تحت کام کریں اور تحقیق کریں، تو جو سوالات آج آپ کو یہاں اٹھانے پڑ رہے ہیں، وہ نوبت ہی نہ آئے۔

صحافت کے چند آفاقی اصول ہیں: مقصدیت (Objectivity)، شفافیت (Transparency)، نقصان نہ پہنچانا (Do No Harm)، مکمل معلومات کی فراہمی (Accountability)۔

لیکن بدقسمتی سے آج کل کے ٹی وی چینلز، ڈیجیٹل صحافی یا سوشل میڈیا کنٹینٹ کریئٹرز کے کام میں یہ اصول دور دور تک نظر نہیں آتے، اور اس کی سب سے بنیادی وجہ یہی ہے کہ اب میڈیا ہاؤسز میں صحافیوں کی فکری اور تیکنیکی تربیت کا کوئی نظام موجود نہیں رہا۔

زاہد فاروق: شجاع صاحب کی بات کی تائید کرتے ہوئے میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ایک وہ دور تھا جب شہری مسائل پر اخبار کے مدیر (Editor) کے نام خطوط لکھے جاتے تھے، تو ان کا ایک فکری اثر ہوتا تھا۔ متعلقہ بلدیاتی ادارے ان خطوط کا نوٹس لے کر مسائل حل کرتے تھے، سنجیدہ آرٹیکلز لکھے جاتے تھے جن پر معاشرے میں بحث ہوتی تھی۔ لیکن آج انتظامی سطح پر اتنی بے حسی اور جمود طاری ہو چکا ہے کہ جب تک عوام سڑکوں پر آ کر احتجاج نہ کریں، ان کی آواز مقتدر ایوانوں تک پہنچتی ہی نہیں ہے۔

اگر گٹر میں گر کر جاں بحق ہونے والے معصوم بچے کے لواحقین سڑک بلاک کر کے احتجاج نہ کرتے، تو آج بھی شہر کے ہزاروں کھلے مین ہولز پر ڈھکن نہ لگائے جاتے۔ ہمارے بیوروکریٹس اور عوامی نمائندے اس وقت تک جاگنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے جب تک لوگ مجبور ہو کر کراچی پریس کلب کے سامنے دہائی نہ دیں۔ اس کڑی دھوپ اور شدید گرمی میں کوئی اپنی خوشی سے سڑک پر نہیں بیٹھتا۔

ابھی گزشتہ ہفتے کا واقعہ ہے کہ گٹر کی زہریلی گیس اور صفائی کے دوران حفاظتی انتظامات نہ ہونے کے باعث ایک ہی خاندان کے تین کنڈی مین (صفائی کار) جاں بحق ہو گئے۔ ان کے مظلوم اہلخانہ نے لیاری سے آ کر پریس کلب کے سامنے دھرنا دیا، جس میں شہر کے دیگر علاقوں سے آئے ہوئے غریب مزدوروں نے بھی شرکت کی۔ آج کل کے دور میں تو پٹرول کی گرانی کی وجہ سے غریب کے لیے احتجاج کی جگہ تک پہنچنا بھی ایک بڑا مالی بحران بن چکا ہے۔

نواب علی چانڈیو: سب سے پہلے میڈم سبین آغا کو کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد، میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے اور یہ ایک بہترین دستاویزی کاوش ہے۔ میرا سوال

محترم عارف حسن صاحب سے ہے۔سال 2008 میں آپ کی ایک معرکتہ الآراء کتاب شائع ہوئی تھی جس میں کراچی کے دیرینہ شہری مسائل جیسے پانی کا بحران، ناکارہ سیوریج سسٹم، اور گاڑیوں کے دھوئیں سے پھیلنے والی فضائی آلودگی کا احاطہ کیا گیا تھا جس کی وجہ سے بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ان 18 سالوں میں ان مسائل کو مستقل بنیادوں پر حل کرنے کے لیے کوئی حکومتی یا انتظامی منصوبے بنائے بھی گئے یا نہیں؟

اظہر جمیل (کنسرن سٹیزن الائنس): میں بہت مختصر بات کروں گا۔مجھے سبین آغا صاحبہ کا بیانیہ بہت پسند آیا۔میں نے اپنی ساری زندگی ایک سیاسی ورکر کے طور پر گزاری ہے۔ ہم نے کراچی کے ان گمبھیر بلدیاتی مسائل کو حل کرنے کے لیے سول سوسائٹی کے فعال کردار کے حوالے سے ایک وسیع ڈائیلاگ کا سلسلہ شروع کیا ہے۔میری یہاں موجود تمام محققین، سماجی کارکنان اور طلباء سے گزارش ہے کہ آپ بھی اس ڈائیلاگ کا حصہ بنیں تاکہ ہم مل کر ان مسائل کو اعلیٰ سطح پر اجاگر کر سکیں، شکریہ۔

زاہد فاروق: اظہر جمیل صاحب کی گفتگو کے تناظر میں ایک اہم تنظیمی اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اسی سلسلے میں کل یو آر سی میں ایک اہم مکالمے کا انعقاد کیا ہے۔یہ گفتگو مین لائن ٹریک ون (ML-1) کے بڑے منصوبے کے حوالے سے ہے، جو پشاور سے کراچی اور پھر کراچی سے روہڑی تک ڈیزائن کیا جا رہا ہے۔اس ریلوے ٹریک کی توسیع کے لیے غریبوں کے سینکڑوں گھروں کو مسمار کیا گیا اور مزید جائے گا۔کل اس میٹنگ میں ایم ایل-ون کے متاثرین، کراچی سرکلر ریلوے (KCR) اور گجر نالے کے متاثرین کے حقوق اور ان کی بحالی پر تفصیلی بات چیت ہوگی۔جو لوگ بھی اس میگا

پروجیکٹ کی لاگو لاگت، ماحول پر اس کے اثرات اور متاثرین کی موجودہ صورتحال پر ریسرچ میں دلچسپی رکھتے ہیں، وہ کل کے سیشن میں ہمارے ساتھ ضرور شامل ہوں۔

محمد عمر (شریکِ سیمینار): سبین آغا نے کچرے کے حوالے سے جو بات کی، اس پر میرا مشاہدہ یہ ہے کہ پچھلے 18 سالوں سے اس شہر میں سالڈ ویسٹ کو لے کر کوئی پائیدار پلاننگ نہیں کی گئی۔ موجودہ حکومت کی طرف سے کوئی ایسا ماسٹر پلان نہیں بنایا گیا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ روزانہ پیدا ہونے والے ہزاروں ٹن کچرے کو سائنسی طریقے سے کہاں اور کیسے تلف کرنا ہے۔ محلوں میں جگہ جگہ کچرے کے پہاڑ بن چکے ہیں، لوگ مجبوری میں وہاں کچرا پھینکتے ہیں لیکن بلدیہ کی کوئی گاڑی اسے اٹھانے نہیں آتی۔ حکومت اس بنیادی ترین کام سے بھی کیوں قاصر ہے؟

عارف حسن: آپ کا مشاہدہ بالکل درست ہے۔ اس شہر میں کاغذوں کی حد تک منصوبے تو بہت بنائے جاتے ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ ان منصوبوں کے بنیادی مفروضات (Assumptions) ہی سرے سے غلط اور زمینی حقیقت سے دور ہوتے ہیں۔

لیکن میں آپ کو ایک کڑوی حقیقت بتاؤں؛ کراچی کے شہری اس معاملے میں خوش قسمت ہیں کہ یہاں انفارمل سیکٹر اور پرائیویٹ سطح پر کچرا ری سائیکل کرنے والی فیکٹریاں (Recycling Factories) موجود ہیں۔ اگر یہ نجی کباڑیے، چھانٹی کرنے والے اور ری سائیکلنگ کے کارخانے نہ ہوتے، تو کراچی کا انتظامی ڈھانچہ کب کا بیٹھ چکا ہوتا اور آپ سب کچرے کے ڈھیر میں ڈوب کر مر جاتے۔ یہ غیر رسمی شبکہ روزانہ کی بنیاد پر سینکڑوں ٹن فضلہ، لکڑی، پلاسٹک اور کاغذ کو الگ کر کے دوبارہ استعمال کے قابل بناتا ہے، اور اسی انفارمل اکانومی کی وجہ سے یہ شہر چل رہا ہے، ورنہ سرکاری

اداروں کی کارکردگی تو صفر ہے۔

جہاں تک بلدیاتی نظام کی بات ہے، تو صوبہ سندھ کے لیے ایک انقلابی انتظامی ایجنسی قائم کی گئی تھی، جہاں شہری معاملات اور منصوبہ سازی سے جڑے تمام ملوّث افراد کو مشترکہ طور پر تیکنیکی تربیت دی جاتی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی اسکیم تھی جو 1974 میں ڈیزائن کی گئی تھی، مگر سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے اسے چلنے نہیں دیا گیا۔

یہاں اکثر لوگ لاہور اور کراچی کی ترقی کا موازنہ کرتے ہیں۔ میں آپ کو صرف ایک جملے میں یہ بنیادی تضاد سمجھا سکتا ہوں کہ لاہور میں کام جلدی کیوں ہوتا ہے اور کراچی میں کیوں التوا کا شکار رہتا ہے۔

لاہور کا انڈسٹریلسٹ (صنعت کار)، لاہور کا آڑھتی (تاجر)، لاہور کا رئیل اسٹیٹ ڈیولپر، وہاں کا فوجی اور وہاں کا بیوروکریٹ یہ سب عمرانیاتی اور خاندانی لحاظ سے ایک ہی برادری اور ایک ہی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔

آخری بار مجھے اس کا عملی تجربہ تب ہوا جب ہم سپریم کورٹ کی بننے والی ایک ہائی پاور کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے وہاں کام کر رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں جو انتظامی مسائل چند گھنٹوں کی بیٹھک میں حل ہو جاتے ہیں، وہ کراچی میں موضوعِ بحث بھی نہیں بن سکتے۔ کیونکہ وہاں فیصلہ ساز اور اسٹیک ہولڈرز ایک ہی پیج اور ایک ہی خاندانی کڑی میں پروئے ہوئے ہیں، اس لیے چار سے پانچ روز میں بڑے سے بڑا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ میں یہاں ایک بہت متنازعہ مگر سماجی حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ جب تک کراچی کے مختلف نسلی اور سماجی طبقات آپس میں شادیاں کر کے ثقافتی اور خاندانی طور پر ایک اکائی (خاندان) نہیں بن جاتے، تب تک اس شہر میں اجتماعی اونرشپ کا پیدا

ہونا مشکل ہے۔

ایک اور مغالطہ جو اکثر لوگ دہراتے ہیں کہ' کراچی ماضی میں ایک بہت متنوع (Diverse) اور گھلا ملا شہر تھا، تو یہ تاریخی طور پر بالکل غلط بیانی ہے۔ کراچی کی موجودہ کثیر اللسانی آبادی کا بڑا حصہ تقسیمِ ہند کے بعد یہاں منتقل ہوا۔ آزادی کے بعد جب مہاجرین نے پاکستان آنا شروع کیا، تو اس شہر کی جغرافیائی توسیع ہی نسلی اور برادری کی بنیادوں پر کی گئی۔ اس کی ایک لمبی تاریخی فہرست موجود ہے۔

یہاں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مخصوص سوسائٹیز قائم کی گئیں، جہاں یہ غیر اعلانیہ شرط ہوتی تھی کہ اس مخصوص سوسائٹی میں صرف ان کا اپنا برادری والا یا متعلقہ لسانی پس منظر رکھنے والا شخص ہی پلاٹ خرید سکے گا۔ چونکہ لوگ ہجرت کے کلیمز اور کاغذات دکھا کر رہائش حاصل کرتے تھے، اس لیے انہوں نے اپنی حفاظت اور برادری کی قربت کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں کراچی کے اندر مختلف نسلی اور سماجی جزیرے یعنی شہر کے اندر کئی شہر آباد نظر آتے ہیں، جس نے اس میگا سٹی کی یکجہتی اور شہری منصوبہ سازی کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ!

اظہر جمیل (کنسرن سیٹزن الائنس): میں عارف صاحب کی بات کے تسلسل میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب کراچی کے لوگوں میں یہ شعور اور احساس بیدار ہو رہا ہے کہ ان کا ماضی کا شجرہ یا لسانی پس منظر جو بھی رہا ہو، لیکن اب وہ اس شہر کے مستقل مکین ہیں۔ ہمیں شہریوں کے اندر ابھرنے والی اس مثبت اور اجتماعی سوچ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور لوگوں کو آپس میں جوڑنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔

زاہد فاروق: آپ نے بالکل درست کہا۔ ہمیں ہر سطح پر اس سوچ کو پروان

چڑھانا ہوگا کہ ہم سب بلاتفریق کراچی والے ہیں اور خود کو یہاں کا اصل باسی سمجھیں۔ اس شہر کے مستقبل اور بہتری کے بارے میں ہمیں خود ہی سوچنا ہے، کیونکہ شہر کبھی مردہ نہیں ہوتے بلکہ یہ ایک زندہ وجود کی طرح سانس لیتے ہیں۔ اگر آپ منصوبہ بندی کے تحت اس شہر کی جائز بلدیاتی اور انتظامی ضروریات پوری نہیں کریں گے، تو یہ غیر رسمی طریقوں سے خود اپنی ضروریات پوری کرلے گا (جس کا تذکرہ عارف صاحب نے کچرے کی ری سائیکلنگ اور کچی آبادیوں کے حوالے سے پہلے بھی کیا ہے)۔

اس اہم فکری گفتگو کے ساتھ ہی ہمارے آج کے سیمینار کا پہلا سیشن اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ مجھے انتہائی خوشی ہے کہ آج ہمارے اس فورم میں چیئرمین جناح ٹاؤن، جناب رضوان عبدالسمیع صاحب بھی موجود ہیں، جو بلدیاتی سطح پر کمیونٹی کے مسائل کو حل کرنے میں اپنا اہم انتظامی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اب میں مائیک سیما لیاقت صاحبہ کے حوالے کرتا ہوں تا کہ وہ پروگرام کے دوسرے حصے کی کارروائی کا آغاز کریں۔

آپ سب کا بہت شکریہ!

سیما لیاقت: آپ تمام مہمانوں، شرکاء اور بالخصوص ہماری مایہ ناز مصنفہ وصحافی سبین آغا صاحبہ کا بہت بہت شکریہ۔ آج کی یہ علمی نشست اور مکالمہ واقعی انتہائی شاندار رہا۔ ہمارے آج کے سیمینار کا موضوع تھا "کراچی: ریت میں دفن ہزاروں کہانیاں" اور سچ تو یہ ہے کہ کراچی کے سماجی اور بلدیاتی جغرافیے پر ہم جب بھی بات کرنے بیٹھتے ہیں، وقت ہمیشہ کم پڑ جاتا ہے اور بہت سی باتیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میگا سٹی کو گہرائی سے سوچنے، سمجھنے اور اس کی جڑوں کو جاننے کے لیے اربن ریسورس سینٹر (URC) تواتر کے ساتھ اس قسم کے ریسرچ فورمز منعقد کرتا ہے اور ان موضوعات پر

باقاعدہ دستاویزی مواد شائع کرتا ہے۔

تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ، یو آر سی کا ایک پروگرام "کمیونٹی آرکیٹیکٹ ٹریننگ پروگرام" ہے۔ اس تربیتی پروگرام کا بنیادی مقصد نوجوانوں اور بچوں کو اس شہر کا اصل مزاج، اس کا شہری ڈھانچہ اور وقت کے ساتھ اس میں رونما ہونے والی سماجی و جغرافیائی تبدیلیوں سے روشناس کروانا اور فیلڈ وزٹس کے ذریعے مشاہدہ کروانا ہے۔ ہمیں یہ بتاتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ اب تک اس کورس کے 22 بیچز (Batches) کامیابی سے مکمل ہو چکے ہیں اور ہم اپنے 23ویں بیچ کا آغاز کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس کورس کے دوران ہم طلبہ کو جدید ٹیکنالوجی بشمول: آٹوکیڈ (AutoCAD)، تکنیکی نقشہ سازی (Mapping)، جی آئی ایس سروسز (GIS - Geographic Information System) جیسے پروفیشنل ٹولز سکھاتے ہیں تاکہ وہ اپنے علاقوں کی بہتر پلاننگ کر سکیں۔ ہمارے اس کورس کی سرگرم اساتذہ رابعہ صدیقی صاحبہ بھی یہاں ہال میں ہمارے ساتھ موجود ہیں۔

ہمارا دوسرا اہم پروگرام انٹرن شپ پروگرام ہے، جس کے تحت ملک کے مختلف نامور تعلیمی اداروں سے وہ طلبہ ہمارے پاس آتے ہیں جو کراچی کی سماجی ساخت اور شہری ترقی کو علمی بنیادوں پر سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ بچے اپنی ذاتی دلچسپی اور تعلیمی ضرورت کے مطابق یو آر سی کے تحقیقی اسائنمنٹس کا انتخاب کرتے ہیں۔ آج اس ہال میں این ای ڈی یونیورسٹی (NED University) سے تعلق رکھنے والے نوجوان اسٹوڈنٹس کا ایک بڑا گروپ موجود ہے، جنہوں نے حال ہی میں ہمارے ساتھ اپنی انٹرن شپ مکمل کی ہے اور انتہائی محنت کے ساتھ اپنے فیلڈ اسائنمنٹس تیار کیے ہیں۔ آج کا یہ دن ان

تمام نوجوانوں کے لیے سنگِ میل ہے، کیونکہ ہم آج کمیونٹی آرکیٹیکٹ کورس کے 22 ویں بیچ کے کامیاب طلبہ اور این ای ڈی یونیورسٹی کے انٹرنز میں ان کی کارکردگی کی اسناد تقسیم کرنے جا رہے ہیں۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ ہمارے معزز مقررین سبین آغا صاحبہ اور جناب عارف حسن صاحب یہاں موجود ہیں، جن کے ہاتھوں سے یہ اسناد طلبہ کو دی جائیں گی۔ مستقبل کی ذمہ داریاں اور اختتامی کلمات میں آخر میں صرف یہی کہوں گی کہ شہر کو محض دیکھنا نہیں، بلکہ اسے سائنسی طور پر سمجھنا اور جاننا ضروری ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو طلبہ اور انٹرنز آج یہاں سے اسناد لے کر جا رہے ہیں، ان کے کندھوں پر اب ایک بڑی سماجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آپ کو اپنے اپنے علاقوں کے مسائل کو مزید گہرائی سے جاننا ہے اور یو آر سی سے حاصل کردہ تیکنیکی تربیت کے مطابق اپنے علاقوں کی نقشہ سازی کرنی ہے۔

میری آپ سے گزارش ہے کہ اس تحقیقی کام کو یہیں نہ چھوڑیں، بلکہ اسے اپنی عملی اور پیشہ ورانہ زندگی کا مستقل حصہ بنائیں۔ ایک اور خوش آئند بات یہ ہے کہ کراچی کی تاریخ، ثقافت اور سماج پر لکھنے والے قلم کاروں اور محققین کے ساتھ یو آر سی کا تیکنیکی تعلق دن بہ دن مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے ساتھ اس فورم میں لیاری کی تاریخ پر کام کرنے والے نامور محقق بھی موجود تھے، جنہوں نے لیاری کے ایک ایک گلی کوچے کو ریسرچ کے لیے مکمل طور پر کھنگال ڈالا ہے اور ان کی کتاب پڑھ کر اس شہر کے پوشیدہ پہلو سامنے آتے ہیں (وہ شاید کسی ناگزیر کام کی وجہ سے جلدی چلے گئے)۔ جب ایسے مخلص اور علم دوست لوگ یو آر سی کے پلیٹ فارم پر آتے ہیں، تو ہمیں دلی مسرت ہوتی ہے۔ سیمینار کے اختتام پر میں آپ تمام معزز مہمانوں، بیوروکریٹس، صحافیوں اور

اسٹوڈنٹس سے درخواست کروں گی کہ ہمارے ساتھ چائے نوش فرمائیں۔آپ سب کا بہت شکریہ!

تقسیم اسناد

☆-----------☆-----------☆

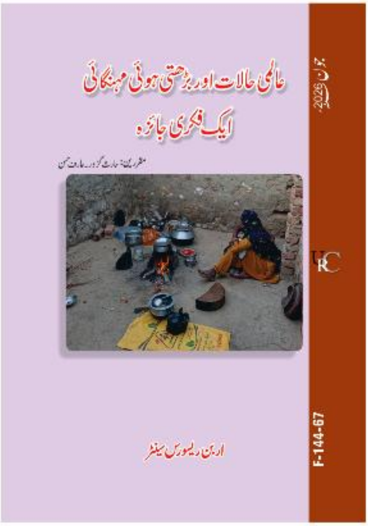
عالمی حالات اور بڑھتی ہوئی مہنگائی
ایک فکری جائزہ
مقررین: حارث گزدر، عارف حسن
اربن ریسورس سینٹر
جون 2026ء
F-144-67

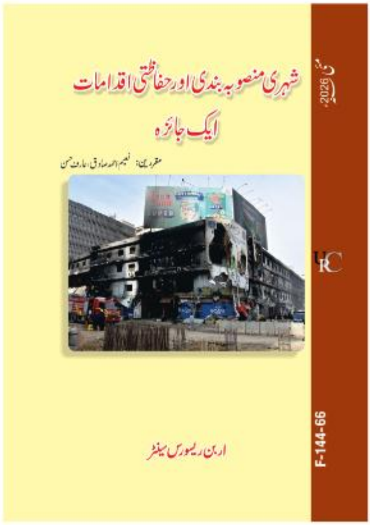
شہری منصوبہ بندی اور حفاظتی اقدامات
ایک جائزہ
مقررین: نعیم احمد صادق، عارف حسن
اربن ریسورس سینٹر
مئی 2026ء
F-144-66

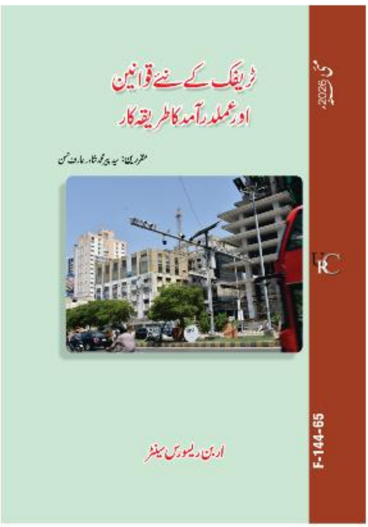
ٹریفک کے نئے قوانین
اور عملدرآمد کا طریقہ کار
مقررین: سید پیر محمد شاہ، عارف حسن
اربن ریسورس سینٹر
مئی 2026ء
F-144-65

یو آر سی فورم سیریز

یو آر سی ملکی اور بین الاقوامی ترقیاتی منصوبوں کے مسائل پر کام کرنے والے ممتاز ماہرین کے لیکچرز کا اہتمام کرتا ہے جن کے بنیادی سطح پر مسائل کے حل پر کام کرنے والے کارکنان، این جی اوز کے نمائندے سرکاری اداروں سے وابستہ اہلکار میڈیا اور تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد اور متعلقہ لوگ شرکت کرتے ہیں۔ یہ فورم تنظیمی اور انفرادی سطح پر کام کرنے والوں کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے کام کا وسیع قومی اور بین الاقوامی معاملات سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ یہ لیکچر ان تحریکوں کے لئے کام کرنے والوں کو معلومات فراہم کرتے ہیں جو پاکستان اور خصوصی طور پر کراچی میں منصفانہ اور ایسی حکمت عملیوں کے وضع کرنے کے لئے چلائی جا رہی ہیں جن کا مقصد صرف عوامی ترقی ہو۔

"کراچی: ریت میں دفن ہزاروں کہانیاں"

کے عنوان سے یہ فورم 28 اپریل 2026ء کو یو آر سی میں منعقد ہوا۔